R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29

Annual Rs. 5/-

per Copy-15 P.

Date

1-8-15-22

جلد ۲۷۔ شمارہ ۸ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۲۲ فروری ۱۹۶۸ء

اداریہ

انجمن کی عمارت کیلئے فنڈ کی اپیل

انجمن ترقی اردو کا آغاز آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبے کی حیثیت سے ۱۹۰۳ء میں ہوا۔ اس کے پہلے سکریٹری علامہ شبلی تھے۔ ۱۹۱۳ء میں یہ ایک آزاد ادارہ ہو گئی۔ مولوی عبد الحق کی ان تھک کوششوں سے اس نے بڑی ترقی کی ۱۹۳۸ء میں مولوی عبد الحق اس کا دفتر دہلی لے آئے۔ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دریا گنج میں اس کا دفتر لٹا تو مولانا آزاد نے اس کی حفاظت کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اسے علی گڑھ لے آئے لیکن یہ برابر خیال رہا کہ اس کا صدر دفتر دہلی میں ہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ حکومت ہند سے رعایتی قیمت پر زمین کے لیے درخواست کی گئی۔ حکومت نے راوز ایونیو میں جو شنکر روڈ کے قریب ہے چوتھائی ایکڑ زمین رعایتی قیمت پر دے دی ہے۔ عمارت کے لیے نقشہ ایک اچھے آرکی ٹکٹ مسٹر بھرودا ج نے تیار کیا ہے۔ یہ عمارت پانچ منزل کی ہوگی اور اس کی لاگت کا تخمینہ ساڑھے سات لاکھ روپیہ کیا گیا ہے۔ انجمن کے پاس عمارت کے لیے ڈیڑھ لاکھ کے قریب روپیہ محفوظ ہے۔ حکومت ہند سے بھی گرانٹ کی درخواست کی گئی ہے، لیکن ہم کو پانچ لاکھ روپیہ اردو دوستوں سے جمع کرنا ہے۔ چندے کے لیے بڑے پیمانے پر مہم شروع ہونے والی ہے۔ ہندستان میں تین کروڑ کے قریب اردو بولنے والے ہیں۔ اردو کے ان ہمدردوں کی تعداد اس کے علاوہ تین کروڑ سے کم نہ ہوگی جن کی زبان اگرچہ اردو نہیں ہے مگر جو اردو زبان کی ترقی چاہتے ہیں اور اس کے ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے پانچ لاکھ کی رقم کوئی ایسی رقم نہیں ہے جو چھ مہینے میں جمع نہ ہو سکے۔ عمارت کا سنگ بنیاد عنقریب وزیر اعظم کے ہاتھوں رکھا جائے گا اور عمارت کی تکمیل ایک سال بھر کے اندر کرنا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ عمارت کا نام اردو بھون رکھا جائے۔

چندے کی فراہمی کے لیے ٹکٹ کے دو حصے ہوں گے۔ ادنیٰ تو ہزار روپے، سو روپے، دس روپے، اور ایک روپیہ کے عطیات کے لیے علیحدہ علیحدہ رسید کی کتابیں چھپوائی جائیں گی، دوسرے بمبئی، دہلی، حیدرآباد اور دوسرے بڑے شہروں میں خاص خاص کمیٹیوں کے زیر اہتمام تہذیبی پروگرام ہوں گے جن کے لیے ٹکٹ رکھا جائے گا۔ عمارت کے نقشے ایک فولڈر کے ذریعہ سے اردو دوستوں کو بھیجے جائیں گے۔ انجمن دراصل ایک عوامی ادارہ ہے قریب قریب تمام ریاستوں میں اس کی ریاستی شاخیں ہیں۔ مقامی شاخوں کی تعداد چار سو کے لگ بھگ ہے۔ ... ہمہ گیر تنظیم کے ذریعے پانچ لاکھ روپیہ جمع کر لینا ہمارے نزدیک مشکل نہیں ہے بشرطیکہ شاخوں اور اردو کے ہمدردوں کا پورا تعاون ہمیں حاصل ہو۔ انجمن کی مجلس عاملہ کا جلسہ عنقریب دہلی میں ہونے والا ہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہماری زبان میں ضروری اطلاعات جلد شایع ہوں گی۔

دہلی ہندستان کا صدر مقام ہے اور اردو کی جنم بھومی بھی ہے۔ انجمن کے صدر دفتر کو دہلی ہی میں ہونا چاہیے تاکہ حکومت، دہلی کے تہذیبی اداروں اور عوام سب سے گہرا رابطہ قائم ہو سکے۔ ہمیں موجودہ اقتصادی مشکلات کا احساس ہے، مگر انجمن کو آئندہ اور فعال بنانے کے لیے اور اردو زبان و ادب کی بقا اور ترقی کی جدوجہد کو اور قوی اور بااثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جلد سے جلد اپنی عمارت میں منتقل ہو کر یکسوئی کے ساتھ کام کر سکیں۔ اس کام میں ہمیں سارے اردو دوستوں کی مالی امداد کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انجمن کے کام بڑھیں اور پھیلیں، اس کی مطبوعات کی تعداد بڑھے ان کی نکاسی زیادہ ہو، مطبوعات کا دائرہ وسیع ہو اور ان میں علمی، ادبی، قدیم اور جدید ہر قسم کا لٹریچر شامل ہو۔ ہماری تمنا یہ ہے کہ انجمن خود کفیل ہو سکے اور اپنے کاموں کے لیے صرف عوام کی محتاج ہو، حکومت کی امداد پر تکیہ نہ کرے۔ ہمیں یقین ہے کہ سب اردو دوستوں کی بھی یہی خواہش ہوگی۔ آئندہ ہماری زبان کی ہر اشاعت میں اس سلسلے کی ضروری اطلاعات شایع ہوتی رہیں گی۔

مولانا آزاد کی دسویں برسی

مولانا آزاد کے انتقال کو دس سال ہو گئے۔ ہندو... ہے اور سیاسی آدمی کو کچھ لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔ مولانا سے ملک ... تنقیدہ نظر کا علمبردار بن گیا

پیش نظر مولانا کی شخصیت اور کارناموں کا اعتراف ہونا چاہیے۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مولانا نے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے ساتھ قیادت کی اور آزادی کے بعد ملک کو جمہوریت اور سیکولرزم کے راستے پر چلایا۔ آج جمہوریت اور سیکولرزم دونوں کو نئے خطرے درپیش ہیں۔ مولانا نے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی۔ الہلال، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کو اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مولانا کی کوششوں سے انجمن ترقی اردو کو نئی زندگی ملی۔ اس موقع پر جہاں ایک طرف جمہوریت اور سیکولرزم کے استحکام کی اور کوشش کرنی چاہیے اور دوسری طرف اردو زبان کو ملک میں اس کا حق دلانے کے لیے اور زیادہ آئینی اور تعمیری کوششیں کرنی چاہئیں۔ ایک طرف خود اردو کے اسکول کھولنے چاہئیں اور اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے راستے نکالنے چاہئیں اور دوسری طرف عوام اور حکومت کو اردو کا حق دینے کے لیے آمادہ کرنا چاہیے۔ مولانا کی یاد کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے۔

ان میں سے ایک کتاب مختلف حضرات کے نام مولانا کے تقریباً پونے دو سو خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے بیشتر خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔

دوسری کتاب مولانا آزاد پر پاک و ہند کے مستند اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ہر مضمون مولانا کی علمی شخصیت کے ایک خاص پہلو پر ہو۔ یہ دونوں کتابیں ابوسلمان شاہجہاں پوری نے ترتیب دی ہیں۔ مجموعہ مکاتیب اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے اور مجموعہ مضامین سنٹرل بک ڈپو لاہور سے شائع ہو رہے ہیں۔

اے کے ضیا دی راہی

اندھا خواب

کتنی اچھی نظر آتی ہے وہ نیلی دنیا
اربوں روحیں ہوئیں آباد مگر پھر بھی خموش
سرحدیں ہیں نہ ممالک نہ کوئی نام کا شہر
چل مری جان تجھے بھی وہیں لے جاؤں کہ تو
خون ٹپکاتی ہے ہنگامۂ آب و گل میں
اور مری آنکھ سے یہ شے نہیں دیکھی جاتی

جسم جلتا ہے تو ہوتا ہے فروزاں تارا
تیرے بجھنے پہ بھی ہو گا یہی اب اور نہ جل
تیری ہر سانس دھواں بن کے نکلتی ہے یہاں
پھول کی آس عبث ہے کہ فنا ہے بہار
آگ، پانی، ہوا، مٹی کی پرانی دنیا
ہے مگر سارے عناصر ہیں یہاں شعلہ نفس
آگ کے پیڑ شراروں کی زمیں راکھ کے گھر
برف کے خول نے ہر چیز چھپا رکھی ہے
لیکن اس خول سے ہر روح نکل آئے گی
وقت کی بات نہ کر وقت سے پہلے ہی نکل
خواب اندھا ہے مری جان مری آنکھ سے دیکھ
کتنی اچھی نظر آتی ہے وہ نیلی دنیا!

پریم چند کا ناول "رنگ بھومی" کی روسی زبان میں اشاعت

ماسکو۔ سوویت قارئین جو ہندوستانی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں حال ہی میں پریم چند کا ناول "رنگ بھومی" کا روسی زبان میں ترجمہ ملا ہے۔ یہ ترجمہ لینن گراڈ میں ادبی اشاعت گھر کی مقامی شاخ نے شائع کیا ہے۔ سوویت یونین کے تین ممتاز ماہرین علم الہند اے۔ بوروونک، ای۔ تخوتن اور ڈی۔ کراشنینن نیکوف نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ سوویت یونین میں پریم چند کی کئی کہانیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں گئودان، کرم بھومی، غبن اور نرملا شامل ہیں۔

صدر جمہوریہ نے غالب میموریل کا سنگ بنیاد رکھا

نئی دہلی۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۲۰ فروری کو منڈی ہاؤس میں دہلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے تعمیر کیے جانے والے غالب میموریل کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس عمارت پر ۱۵ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ (قومی آواز)

مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں برسی

دلی۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی دس سالہ برسی امسال ۲۲ فروری کو منائی جا رہی ہے۔ اس موقع پر صبح کو حضرت مولانا آزاد کے مزار پر ایک مختصر سی تقریب ہوگی جس میں امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔ (سیاست)

مصنفین نیا لسانی فارمولا تلاش کریں گے

کانپور، ۲۰ فروری۔ اگلے مہینے یہاں مصنفوں کی ایک آل انڈیا لسانی کانفرنس ہوگی جس میں قومی زبان کا کوئی ایسا فارمولا تلاش کیا جائے گا جو سب کو قابل قبول ہو اور قومی یک جہتی کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری

علی گڑھ۔ امسال جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر مسلم یونیورسٹی سے اردو میں چار طلبہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ان کے نام اور موضوعات درج ذیل ہیں۔

۱۔ جمال شریف: دکن سے پہلے اردو شاعری کی دکن میں نشو و نما۔
۲۔ اسماء سعیدی: حسرت عظیم آبادی زندگی اور شاعری
۳۔ نیر اقبال: اردو قواعد نویسی
۴۔ اسلم رضوی: PHONETICS AND PHONOLOGICAL STRUCTURE OF URDU.

مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں برسی پر دو نئی کتابیں

فروری ۱۹۶۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں [illegible] دو نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

طیب انصاری

عہد آصفی کے اردو اخبارات

اخبارات کا کام صرف "مخبری" نہیں ہوتا بلکہ سماج اور تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں ترقی پسند اقدار اور اصولوں کے تحفظ کے ذریعہ اہم فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ یہ کہنے کو تو "خبر رسانی" کا کام کرتے ہیں لیکن خبر رسانی کا یہ فرض کچھ اس انداز میں پورا کیا جاتا ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں چونک پڑتی ہیں، قومی تحریکیں ہوں کہ انفرادی کوششیں سبھی ان ہی اخبارات کے ذریعہ پھیلتی ہیں ۔۔۔ کے خوابوں کی تکمیل میں ان روزناموں کا اہم رول رہتا ہے۔ اخبار درحقیقت صحیفہ ہوتا ہے اعلیٰ ترین افکار اور اعلیٰ ترین اصولوں کا۔ انسانیت کے ارتقا میں ان اخبارات نے جو رول ادا کیا ہے اور آج کے اس جمہوری دور میں یہ جو قبول ہو رہی ہیں ان میں ان ہی اخبارات کا اہم حصہ ہے۔ جدید تہذیب ان ہی اخبارات کی زندگی سے عبارت ہے۔ دنیا میں جتنے بڑے انقلابات آئے ہیں اور جو بیسویں صدی میں اور اس سے ایک صدی قبل بھی، یہ تمام کے تمام ثمرات اخبارات ہی کا حاصل ہیں۔ چنانچہ خود حیدرآباد کی تہذیب کی شکست و ریخت میں حیدرآباد کے اردو اخبارات نے گراں قدر فرض انجام دیا ہے۔ حیدرآباد کی تہذیب کو سمجھنے، یہاں کے احوال سے قریب ہونے اور حیدرآباد کی سیاسی زندگی کے پیچ و خم پر نظر رکھنے کے لیے حیدرآباد کے اخبارات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے بلکہ ان اخبارات کے مطالعہ کے بغیر حیدرآباد کی تہذیبی، معاشرتی، تمدنی، ادبی اور سیاسی زندگی کی تاریخ لکھی نہیں جا سکتی۔

ویسے تو حیدرآباد سے اخبارات کی اشاعت کا آغاز حاجی کرتاز کے روزنامہ "شوکت الاسلام" سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۸۰۸ء میں شائع کیا تھا لیکن رسائل کی زندگی کا آغاز قرطبی اسکول کے "رسالہ طبابت" سے ہوتا ہے جو سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے مختلف … ماہانہ، سہ ماہی، دوماہی، پندرہ روزہ اور ہفتہ وار رسائل شائع ہونے لگے۔ "شوکت الاسلام" بھی درحقیقت ۱۸۷۷ء سے ہفتہ وار شائع ہو رہا تھا جو بعد کو روزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ سلطان محمد عاقل نے "ہزار داستان" کے نام سے ۱۸۸۵ء میں روزنامہ جاری کیا جو چار سال تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ امجد علی اشہری نے ۱۸۸۵ء میں "سفیر دکن" اور ۱۸۸۷ء میں اخبار "آصفی" جاری کیا۔ افسر الملک تو بڑے فوجی عہدہ دار لیکن انھیں سماجی قدروں اور ادبی سرگرمیوں سے انس سا تھا وہ ادب کے شیدائی تھے اسی وجہ سے وہ حیدرآباد کی سماجی زندگی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ "افسر الاخبار" کا اجرا ان کے ادبی ذوق اور حیدرآبادی زندگی کے پیچ و خم سے دلچسپی کا مظہر ہے۔ بعد کو یہ اخبار بند ہو گیا اور اس کے بعد انھوں نے ایک ماہنامہ "افسر" (۱۸۹۰ء) جاری کیا جس سے مولوی عبدالحق اور محب حسین بھی منسلک رہے ہیں۔ "مشیر دکن" کا اجرا ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ اس کے ایڈیٹر کشن راؤ تھے۔ یہ اخبار آج بھی جیسا تیسا شائع ہوتا رہتا ہے۔ ۱۹۰۲ء میں صادق حسین نے "علم و عمل" کے نام سے روزنامہ جاری کیا تھا لیکن محب حسین درحقیقت حیدرآباد میں اردو صحافت کے بانی ہیں جنھوں نے ۱۹۰۴ء میں اسی نام سے دوسرا روزنامہ جاری کیا اور صحافت کی صحت مند قدروں کی بنا بھی ڈالی۔ پروفیسر زینت ساجدہ کے الفاظ میں یہ دکن کے نثری میں اور اردو صحافت کے "معمار اولین" کہ جنھوں نے اپنے زور قلم سے حیدرآبادی تہذیب میں انقلاب تازہ کیا۔ اپنے افکار و خیالات کے ذریعہ سماجی قدروں کو بدلنے اور فرسودہ روایات کو مٹانے کی مہم جدوجہد کی۔ نسوانی زندگی میں نئی تبدیلیوں کو لانے کی جو جدوجہد محب حسین نے کی ہے اس کی مثال حیدرآباد کی سماجی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ محب حسین کے حیدرآبادی خواتین پر بڑے احسان ہیں کہ انھوں نے خواتین دکن کو انگریزی تہذیب سے کچھ باہر لانے اور جہالت کے پردوں سے اجالوں کی دنیا میں پہنچانے کا اہم اور مشکل ترین کام انجام دیا ہے۔

"صحیفہ" ابتدا میں ماہنامہ تھا جو ۱۹۰۵ء میں "موسوم بنام تاریخی" جاری ہوا۔ رضی الدین کیفی اس کے ایڈیٹر تھے لیکن دوسری بار ۱۹۱۰ء میں ادارہ معارف کی طرف سے جاری ہوا اور ادارت کی ذمہ داری اکبر علی کو سونپی گئی۔ "صحیفہ" خادم ادب تو تھا ہی یہ دور حیدرآباد کا سب سے پہلا "خادم ملک و ملت" ہونے کا دعویدار بھی بن گیا اور ۱۹۱۲ء میں محمد مظہر کے زیر ادارت روزانہ شائع ہونے لگا۔ اس سے قبل ۱۹۱۱ء میں "معارف" نامی ایک روزنامہ بھی جاری ہوا تھا لیکن تفصیلات ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ "صحیفہ" کے بعد جس اخبار نے حیدرآبادی معاشرہ کو زیادہ متاثر کیا ہے وہ "رہبر دکن" ہے۔ "رہبر دکن" کو مولوی احمد محی الدین نے ۱۹۱۲ء میں جاری کیا اور حیدرآباد کا یہ ممتاز اخبار حیدرآباد کی سیاسی تبدیلیوں تک زندہ رہنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں بند کر دیا گیا۔ "رہبر دکن" کا آخری دور حیدرآباد کی سیاسی زندگی کا اہم ترین زمانہ ہے۔ مسلم سیاست پہلی بار قومی سیاست سے دست و گریباں ہوئی۔ شب و روز کے بدلتے ہوئے حالات میں "رہبر دکن" نے مسلم نواز حکمت عملی اختیار کی اور اسی وجہ سے "اتحاد المسلمین" حلقہ میں بے حد مقبول رہا۔ ۱۹۱۲ء میں حیدر شاہ نے "عثمانی گزٹ" جاری کیا جو ایک عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ احمد عارف اور علی اشرف صحافت کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے "صبح دکن" کے ذریعہ صحافت کو نئی قدروں سے روشناس کرایا۔ ۱۹۲۷ء میں بابائے صحافت وقار احمد نے "نظام گزٹ" جاری کیا جو ان کے انتقال کے بعد بھی سال گزشتہ تک نکلتا رہا۔ "نظام گزٹ" حضور نظام حضرت آصف سابع مرحوم کا آرگن بن گیا تھا۔ اس میں ان کے کلام کے علاوہ "فرمان" بھی شائع ہوتے تھے۔ "رعیت" حیدرآباد کے قوم پرست اخبارات میں کافی اہم جگہ رکھتا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۷ء تک نرسنگ راؤ کے زیر ادارت جاری رہا۔ نرسنگ راؤ صحافی بھی تھے اور سیاسی آدمی بھی۔ اسی وجہ سے "رعیت" ایک خاص نقطۂ نظر کا علمبردار بن گیا

"شوکت الاسلام" سے "رعیت" تک پہنچتے پہنچتے ہمارے اخبارات سیاسی انقلابات کے نقیب بن چکے تھے۔ اب وہ سادہ لوحی باقی نہ رہی تھی جو محب حسین کے اخبارات کا طرۂ امتیاز تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی ہندوستان مختلف سیاسی و سماجی تحریکات کی جولان گاہ بن گیا تھا۔ اس کا لازمی اثر دکن پر بھی پڑا۔ حیدرآباد میں قومی تحریکوں میں حصہ لینے کا آغاز ہوا۔ سیاست کی دنیا میں جو انقلابات آئے ہیں ان کی تاریخ جاننے کے لیے "رہبر دکن" اور "رعیت" کے ساتھ ساتھ "وقت" اور "منشور" کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ان اخبارات کو ایک کے بعد دیگرے عبدالرحمن رئیس نے ۱۹۳۰ء میں جاری کیا۔ "پیام" کی شہرت قاضی عبدالغفار کے قلمی کاوشوں کا رہین منت ہے یا پھر یہ کہنا مشکل ہے کہ قاضی صاحب کی صحافتی شہرت "پیام" کی وجہ سے رہی ہے۔ "پیام" حیدرآباد کے ان اخباروں میں سے ایک تھا جس نے یہاں کی تہذیب کو بھی اور سیاست کو، دونوں کو متاثر کیا ہے۔ ادب میں نئے رجحانات کی ترویج میں "پیام" نے گرانقدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ اپنے "عصر" پر محیط تھا اس وجہ سے اردو ادب میں بھی "عصری" رجحانات دخیل ہو گئے۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۵۰ء تک قاضی صاحب مرحوم کے زیر ادارت جاری رہا بعد کو ۱۹۵۴ء تک اختر حسین صاحب کی نگرانی میں شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ اختر حسین صاحب کو "پیام" کی "باقیات الصالحات" میں سے سمجھنا چاہیے۔

"میزان" (۱۹۴۳ء) حبیب اللہ اوج کے زیر ادارت اور "تنظیم" علی اشرف کی نگرانی میں اور "امروز" (شعیب اللہ) ۱۹۴۷ء سے شائع ہوئے۔ "میزان" صحت مند اقدار کا علمبردار اخبار تھا۔ حیدرآباد کی سیاسی کشمکش کی پرچھائیاں یہاں بھی نمایاں ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں اور اس کے بعد حیدرآباد سے کئی اخبارات شائع ہوئے لیکن اس زمانہ میں حیدرآباد کا انضمام مکمل ہو چکا تھا۔ سیاست کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک "طوفان بلا" اٹھنے کے بعد چاروں طرف خاموشی اور سکوت کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ البتہ سسکیوں کی آوازیں زمانہ دراز تک سنائی دیتی رہیں۔ ان سسکیوں کو بعد کے اخبارات میں آپ سن سکتے ہیں۔ انقلاب (مرتضیٰ مجتہدی)، محب دکن (پھاریڈی)، آواز (احمد عبدالقادر)، منزل (اختر حسین رضوی)، ملاپ (یدھ ویر)، اقدام (مرتضیٰ مجتہدی)، نئی زندگی (جے این شرما)، شعیب (رئیس الرحمن)، ہمدرد (نقش عالمی)، ہمدم (جمال الدین)، تازیانہ (سعادت جہاں)، ہمارا اقدام (زین العابدین)، نیا زمانہ (احمد اختر)، انگارہ (مرتضیٰ مجتہدی)، انگارے (حسین فاروقی)، اپنا اقدام (شریف اسلم جابد آفاقی)، وطن (راشد جلی)، امر بھارت (ٹھاکر پورن چند)، اور صداقت (وحید الحسن)

"رہنمائے دکن" درحقیقت "رہبر دکن" کے بند ہونے کے بعد جاری ہوا۔ منظور حسن صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ ۱۹۴۹ء سے "سیاست" عابد علی خان صاحب کی زیر نگرانی جاری ہوا۔ حیدرآباد کے موجودہ اخبارات میں سیاست، رہنمائے دکن، ملاپ، انگارے اور شیر دکن زندہ اخبارات ہیں۔ آزادی سے قبل شائع ہونے والے اخبارات میں "سلطنت" (اسعد اللہ قادری) کافی اہمیت رکھتا تھا۔ "سید اخبار" بھی جاری ہوا تھا جو عرصہ ہوا بند ہو گیا۔ کبھی کبھی شام کو "رہبر دکن" کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔

۱۹۴۸ء کے ناساعد حالات میں اردو اخبارات نے حیدرآباد کی زندگی کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ ذہنی انتشار، سماجی بحران اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنے میں سیاست اور رہنمائے دکن نے اہم حصہ ادا کیا ہے۔ "رہنمائے دکن" کا مزاج مسلم ہے لیکن اپنی خودی کو باقی رکھتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا اور حالات سے نپٹنے کی قوت و صلاحیت پیدا کرنا بھی کوئی غیر اسلامی جذبہ نہیں ہے۔ حالات سے مصالحت بڑی حکمت بھی ہے۔ "سیاست" کے اجراء نے تہذیب کو تو متاثر کیا ہی لیکن ترقی پسند رجحانات کو عام کرنے اور مرحوم جاگیردارانہ مزاج کی جگہ نئی قدروں اور نئے رجحانات کو پھیلانے میں پیش پیش رہا ہے۔ عابد علی صاحب جامعہ عثمانیہ کے تربیت یافتہ ہیں انھوں نے اپنی روشن خیالی سے روزنامہ "سیاست" کو صحت مند اقدار اور ترقی پسند خیالات کا علمبردار بنا دیا۔ اس اخبار کو حیدرآباد کے ممتاز صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور سیاست دانوں کا تعاون حاصل ہے۔ جدید اخبارات کے بارے میں اس سے بھی کھل کر کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ "دیدہ" ہیں صرف "شنیدہ" نہیں۔

ڈاکٹر ریاض الحسن

نواب احمد حسن خاں جوشؔ لکھنوی

نواب احمد حسن خاں جوشؔ[۱] منشی سید مظفر علی خاں اسیرؔ الملقب بہ تدبیر الدولہ مدبر الملک، امیٹھوی کے ایک صاحب دیوان شاگرد تھے۔ نواب حکیم خاں کے بیٹے اور نواب محبت خاں محبتؔ کے پوتے تھے۔ حافظ رحمت خاں کے پرپوتے تھے۔ جوشؔ کی عرفیت "بچھے" تھی۔ ۱۲۴۳ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۲ہجری میں انتقال کیا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں نواب عاشق علی خاں عاشورؔ اور راسخؔ مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر اسیرؔ کی شاگردی اختیار کی۔

جوشؔ کے دو دیوان مسمّی بہ "بہارستان جوشؔ" و "چمنستان جوشؔ" اور نثر میں ایک قصہ "فسانۂ جوشؔ" شایع ہو چکے ہیں "چمنستان جوشؔ" کا دوسرا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنؤ سے ۱۲۹۰ ہجری میں شایع ہوا جو راقم کے پیش نظر ہے اس میں ۲۲۸ صفحات ہیں ۱۹۷ صفحہ تک غزلیات کا سلسلہ ہے۔ اس کے بعد قطعات تاریخ جو مختلف حضرات کی تصانیف، ذکر ولادت، ذکر وفات اور سنین طباعت پر مشتمل ہیں اس دیوان میں درج ہیں۔ اسیرؔ کے بڑے صاحبزادے سید غضنفر علی خاں حکیمؔ نے اس دیوان پر ایک منثور تقریظ لکھی ہے جو صفحہ ۲۲۵ پر درج ہے۔ اس میں چند فارسی غزلیں بھی شامل ہیں۔ غزلیات کے خاتمہ پر مختلف شعرائے اردو کی غزلوں پر مخمس درج ہیں۔ ہر غزل کا نمبر اور اس کے اشعار کی تعداد غزل کے شروع میں لکھی ہے۔ دیوان کی اہمیت کا اندازہ اسیرؔ کے اس قطعہ سے کیا جاسکتا ہے ؎

ہوا جو بار دگر طبع یہ کلام فصیح
کہ جس کا حسن ہے ارباب فہم پر ظاہر
لکھا اسیرؔ نے تاریخ طبع کا مصرع
کلام جوشؔ ہے قند مکرر نادر
(۱۲۹۰ھ)[۲]

جوشؔ کے کلام میں آپ کو مختلف اثرات نظر آئیں گے۔ کہیں دبستانِ لکھنؤ کا عام اور مبتذل رنگ ہے تو کہیں سنجیدہ شوخی اور متانت، اکثر تصوف اور فلسفہ کے رموز بیان کر جاتے ہیں تو کبھی خالص تغزل کے بھی نمونے پیش کرتے ہیں۔ ابتدا میں اسیرؔ کا رنگ بہت ہلکا ہے اور عام رنگ سخن صاف نمایاں ہے۔

جب استاد اسیرؔ کا رنگ غالب آتا ہے تو اس طرح کے اشعار اچھے اشعار کے سامنے خس و خاشاک کی طرح دب جاتے ہیں۔ اس وقت جوشؔ کے قلم فکر سے ایسے اشعار نظم ہوتے ہیں ؎

بتا جاناں کے ہیں جب اپنی زلف کا عاشق[۳]
گن ہنگار مرا بال بال کرتے ہیں

کس طرح کوچۂ قاتل سے کروں عزم سفر[۴]
ہیں یہاں خود نہیں آیا ہوں قضا لائی ہے

مجھ کو اس سلسلۂ زلف مسلسل کی قسم[۵]
اے شب ہجر نہ آ مدو زمانے۔ ہم کو

انداز بیان اور طرز ادا سے ان فرسودہ اور پیش پا افتادہ مضامین میں جوشؔ نے کتنی جان ڈال دی ہے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار جابجا ملتے ہیں جن میں غزل کی روایتی شان باقی رکھتے ہوئے اپنے مخصوص طرز فکر اور طریقۂ اظہار سے جوشؔ نے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ سادہ اور سلیس زبان میں سہل ممتنع اشعار کہنے پر ان کو بڑا ملکہ حاصل ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آہ سوزاں سے دل جگر نہ پھنکیں[۶]
آگ کا کام ہے جلا دینا
بحث گریہ میں آج ہاں اے چشم
ابر کی آبرو گھٹا دینا
ذکریم و رحیم ہے اے رب
جو ملے ہے مرے سزا دینا

رئیسؔ رامپوری

غزل

جب سے دل میں ترے بخشے ہوئے غم ٹھہرے ہیں
محترم اور بھی اپنے لیے ہم ٹھہرے ہیں
دیکھتا یہ ہوں کہ شاید ترا کوچہ، ترا در
سوچتا یہ ہوں کہاں آکے قدم ٹھہرے ہیں
ہم تری راہ میں اٹھے ہیں بڑے عزم کے ساتھ
گردشِ دہر بھی ٹھہری ہے جو ہم ٹھہرے ہیں
غم کو ہر دور میں ٹھہرایا گیا حاصل زیست
اور اس دور میں ہم صاحب غم ٹھہرے ہیں
صرف آنکھوں ہی میں کم رک نہ سکے میری رئیسؔ
میرے آنسو کسی دامن پہ بھی کم ٹھہرے ہیں

---

۱ "جواہر سخن" از کیفی جلد سوم مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد طبع اول صفحہ ۲۷۲ و "سخن شعرا" از عبد الغفور خاں نساخ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۲۹۱ھ صفحہ ۱۱۲ و "خمخانۂ جاوید" جلد دوم صفحہ ۲۸۹ از لالہ سری رام مطبوعہ نولکشور پریس لاہور ۱۹۰۸ء

۲ "چمنستان جوشؔ" مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۲۹۰ھ صفحہ ۲۲۲۔

۳ "چمنستان جوشؔ" صفحہ ۹۶

۴ " " " ۱۲۵

۵ " " " ۱۰۰

۶ " " " ۲۶

وہ بے ثباتیٔ حیات کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ اس کو تفریحِ طبع کا سامان قرار دے کر کیا کیا مزے لیتے ہیں مثلاً ؎

ہوا ثابت مآلِ دولتِ دنیا فقیری ہے[1]
الٹ کر دیکھئے اقبال کو تو لا بقا ٹھہرا

یعنی لفظ اقبال کے ہجے اگر الٹی طرف سے کئے جائیں تو یہی ل ا ب ق ا (لا بقا) بن جاتا ہے۔

جوش کے اکثر اشعار میں رومانویت (جو تغزل کی جان ہے) بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایسے اشعار لکھتے وقت ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسی عالم میں وہ بعض مرصع اور اشعار لکھ ڈالتے ہیں مثلاً ؎

ہم تو کہتے تھے زیادہ نہ بڑھاؤ گیسو[2] — اب تمہیں دیکھو کہ یہ بال گرہ کس کا ہے

بڑھا کے زلف الجھتے ہو ہم نہ کہتے تھے[3] — تمہیں کہو یہ بلا اب وبال ہے کہ نہیں

بگڑی زلفوں کو میں بناتا ہوں[4] — عیب اپنا مرا ہنر دیکھو

اڑ گئے ہجر میں آہوں سے دھوئیں کی مانند[5]
باقی باقی ہے خجالت سے سیہ کا رنگھٹ

زبان اور محاورہ کی چاشنی مندرجہ ذیل اشعار میں بدرجۂ اتم موجود ہے ؎

آ کے بیٹھو گے تو ہو جائے گا محشر برپا[6]
اٹھ کے جاؤ گے جو محفل سے قیامت ہوگی
ان سے کہنے کو جو کہتے ہیں تو فرماتے ہیں
خیر آئیں گے کسی روز جو فرصت ہوگی

لطیف شوخی میں بھی جوش کو بڑا دخل ہے مثلاً ؎

تیری دعوت کے لیے اے غمِ جاناں ہم نے[7]
دلِ بیتاب کو پہلو میں لگا رکھا ہے
کشتۂ زلف کے لٹکائے ہیں در پر لاشے
اپنے گھر کا یہ ستمگر نے پتا رکھا ہے

دیوان گلدستۂ شعراء[8] مطبوعہ ۱۸۷۰ء کے ایک شمارہ میں جوش کی مختصر ایک مثنوی "نامۂ عشق" بعنوان "شعر بیتابیٔ دل" بر خروش شائع ہوئی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

قاصدا تو ہی جانِ عاشق ہے — قاصدا تو ہی دحی ناطق ہے

پھر ۲۳ اشعار کے بعد ایک غزل درج ہے جس کا مطلع حسبِ ذیل ہے ؎

اس میں ہندو ہے یا مسلماں ہے — بخدا دل سے تیرا خواہاں ہے

اور مثنوی کا آخری شعر یہ ہے ؎

مال و زر تجھ کو دوں گا اے قاصد — تیرا ممنون رہوں گا اے قاصد

اس مختصر مثنوی میں کل ۱۰۹ اشعار ہیں۔ مثنوی کی زبان سلیس اور شگفتہ ہے۔ پیشِ نظر گلدستہ میں اس مثنوی کے علاوہ متعدد غزلیات، مخمسات، تضمینات اور قطعات تاریخ درج ہیں۔ ایک نعت سرورِ کائنات، ایک قصیدہ در منقبت حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ اور ایک فارسی تضمین بھی موجود ہے۔ نعت ۹ اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع درج ذیل ہے ؎

فخرِ آدم، رحمت اللعالمیں ہیں مصطفےٰ — رہبرِ راہِ خدا سلطانِ دیں ہیں مصطفےٰ

نعت میں وہی روایتی انداز ہے جو محسن کاکوروی سے پہلے عام طور پر اردو شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ قصیدۂ منقبت بھی نامکمل شائع ہوا ہے اور صرف ۱۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ عنوان میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

"چند اشعار از العصر بطور قصیدہ در منقبت سرورداریں حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ رضی اللہ تعالے عنہما از تصنیف نواب ممدوح الصدر"

قصیدۂ منقبت سے قبل مذکورہ نعت درج ہے۔ قصیدہ کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں ؎

مہر و خورشید سے مشہور سوا دونوں ہیں — شمعِ عرفاں کی ضیا، نورِ خدا دونوں ہیں
منبعِ لطف ہے نکو ہے، یہ خبر ہیں اس کی — شرطِ لطف و کرم اس کی جو ادا دونوں ہیں
اپنے سائل کو طلب سے بھی سوا دیتے ہیں — واہ کیا نامِ خدا اہلِ سخا دونوں ہیں
صدمۂ فقر سے اے جوش پریشاں کیوں ہو — تیری امداد کو بیعقدہ کشا دونوں ہیں

جوش کا کلام اپنے عہد کا مخصوص ترجمان ہے۔ لکھنوی رنگِ سخن کی اصلاح امیرؔ (امیر مینائی)، ریاض خیر آبادی، انیسؔ، دبیرؔ اور محسن کاکوروی نے جس طرح اپنے اپنے وقت، استعداد اور مذاق کے موافق کی اس کو مکمل سے مکمل تر بنانے کا کام ان حضرات کے سلسلے کے دوسرے شعراء نے جاری رکھا۔ جوش کا نام بھی اس زمرہ میں ایک ممتاز جگہ کا حامل ہے۔ مگر یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ کافی تلاش و جستجو کے باوجود جوش کا مزید سرمایۂ کلام اور ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات فراہم نہ ہو سکیں۔ قارئین کرام اور اربابِ علم سے گزارش ہے کہ وہ اس موضوع پر روشنی ڈال کر تشنگی دور کرنے کی سعیٔ بلیغ کریں گے۔

---

[1] خیابانِ جوش، صفحہ ۱۴
[2] " " " ۱۴۱
[3] " " " ۸۲
[4] " " " ۱۰۱
[5] " " " ۲۵
[6] " " " ۱۵
[7] " " " ۱۲۲
[8] جلد ۱، نمبر ۱۲ کالم ۱ و ۲ صفحہ ۱۰ تا ۱۲

مراسلات

بسلسلۂ داغؔ دہلوی

"ہماری زبان" بابت ۸ نومبر ۱۹۶۷ء اور ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء پیش نظر ہیں جن میں جناب دریندر پرشاد سکسینہ اور جناب ظفر الاسلام ظفر صاحب نے داغؔ کے شاگردوں کے سلسلے میں سیمابؔ اکبرآبادی اور جگرؔ مرادآبادی کے نام لیے ہیں۔ ایک نے اقرار شاگردی کے ساتھ دوسرے نے انکار کے ساتھ۔

جہاں تک سیمابؔ کا تعلق ہے وہ یقیناً داغؔ کے شاگرد تھے اور شاگرد خاص تھے۔ ظفر الاسلام ظفر صاحب نے اس سلسلے میں مولانا احسن مارہروی کا ایک حوالہ نقل کیا ہے یہ حوالہ مستند ہے۔ دوسرے حضرات نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں دور جانے کی ضرورت نہیں خود سیمابؔ اکبرآبادی صاحب نے اس کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ نگار ۱۹۳۵ء (اردو شاعری نمبر) کے ص ۲۱۶ پر "آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق" کے تحت لکھتے ہیں:

> "آخر ان دونوں مراکز ادب کے شاعرانہ تعلق کی تجدید ۱۸۹۹ء میں راقم السطور نے کی یعنی میں نے فصیح الملک نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی سے رشتۂ تلمذ پیدا کر کے آگرے اور دہلی میں پھر ایک شاعرانہ تعلق قائم کر دیا۔"

اس بیان سے صرف یہی نہیں کہ سیمابؔ کا داغؔ کا شاگرد ہونا ثابت ہو جاتا ہے بلکہ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ کب اور کس عمر میں داغؔ کے شاگرد ہوئے۔

جگرؔ کے سلسلے میں البتہ کچھ وثوق سے کہنا مشکل ہے، ہر چند کہ راقم الحروف نے بھی فروری ۱۹۶۶ء نگار میں (صفحہ ۲۳) پر جگرؔ کو داغؔ کا شاگرد ظاہر کیا ہے لیکن یہ یاد نہیں کہ کہاں دیکھا تھا اور کس بنا پر ایسا لکھ دیا۔ بہرحال یہ بات قابل توجہ ہے نگار کے داغؔ نمبر میں پروفیسر نفیس سندیلوی نے "بقول نوح ناروی" جگرؔ کو داغؔ کا شاگرد بتایا ہے۔

اگر نوحؔ کا یہ قول کہیں تحریری صورت مل جاتا تو بات بن جاتی مشکل یہ ہے اسی داغؔ نمبر میں "فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی" کے عنوان سے نوحؔ ناروی کا مضمون بھی ص ۲۵ پر موجود ہے۔ اس میں نوحؔ صاحب نے ص ۳۰ پر داغؔ کے ممتاز شاگردوں کے نام گنوائے ہیں۔ اس میں جگرؔ مرادآبادی کا نام نہیں ہے۔ پھر کو نسا ماخذ ہے جس کی بنا پر نفیس سندیلوی نے نوحؔ کے حوالے سے جگرؔ کو داغؔ کا شاگرد قرار دے دیا۔ ظفر الاسلام صاحب نے اپنے پیرائے میں جو حوالے درج کئے ہیں وہ بھی قابل توجہ ہیں، نیز یہ بات کہ جگرؔ چونکہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے اس لیے داغؔ کے شاگرد نہیں ہو سکتے چنداں قابل اعتنا نہیں اس لیے کہ تاریخ ادب میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگ ۱۲-۱۳-۱۰ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے ہیں اور علوم مروجہ سے فارغ التحصیل ہو گئے ہیں اس لیے ۱۹۰۵ء میں داغؔ کی وفات اور ۱۸۹۰ء میں جگرؔ کی پیدائش بھی طور پر استادی شاگردی میں مانع نہیں ہو سکتی۔ اس پر مزید غور و خوض اور تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔

(فرمان فتحپوری)

کچھ ہماری زبان کے بارے میں

"ہماری زبان" مورخہ یکم فروری ۶۷ء کے صفحہ گیارہ پر یونیورسٹیوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے "کہ یونیورسٹیوں کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ غریب کی بھابی بن کر رہ گئی ہیں" اس علاقہ میں مثل مشہور ہے کہ غریب کی بیوی سب کی بھابی اور دوسرے طبقوں میں تشریح یہ کی جاتی ہے کہ غریب کی بیوی کو سب لوگ بھابی کہتے ہیں لیکن امیر کی بیوی کو سب بابی کہتے ہیں۔ غریب کی بیوی کے بدلے غریب کی بھابی نہیں ہوتے۔ اگر یہ وضاحت صحیح اور قابل قبول ہے تو غالباً راقم نے کہاوت کا صحیح استعمال نہیں کیا یا کاتب سے غلطی سرزد ہوئی۔

ہماری زبان میں "میرا صفحہ" اور "مکتوب لندن" دونوں کے متعلق یہ خیال ہے کہ ان عنوانات کے تحت بہت مفید مضامین تحریر کئے جاتے ہیں اور قارئین کی معلومات میں نہایت مفید اضافہ ہوتا ہے۔ ہماری زبان کی ترتیب میں بھی خوشگوار تبدیلی کی گئی ہے۔ البتہ نئی ترتیب کی وجہ سے ہماری زبان میں نظمیں غزلیں قطعات وغیرہ بہت کم کر دیے گئے ہیں جو پہلے ہی سے کافی کم تھے اور ایک صفحہ سے زائد جگہ نہیں دی جاتی تھی۔ غالباً ایک دو غزلیں اور ایک دو نظمیں وہ بھی آزاد و معرا شائع کی جا رہی ہیں۔ اور ان کے لکھنے والے بھی مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں۔

(بشیر احمد شہید اکولہ)

لفظ اردو کے ماخذ کے سلسلے میں

قومی زبان (کراچی) جلد ۲۰ شمارہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۸ء صفحہ ۱۷ کے حاشیہ میں درج ہے "۱۵ جنوری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں جو کل ہند اردو کانفرنس ہوئی تھی اس کی سبجکٹ میٹنگ میں ڈاکٹر محمود صاحب نے یہ تحقیقی نکتہ ظاہر فرمایا تھا کہ اردو سنسکرت کے لفظ اردو سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں کلچر (یعنی زبانوں کا کلچر) براہ کرم اس پر کسی اشاعت میں تبصرہ فرمایا جائے اور سنسکرت لفظ کو اصلی یعنی (SCRIPT) میں لکھا جائے۔

(سجاد مرزا)

نوٹ:- یہ کانفرنس ۱۵ فروری کو ہوئی تھی ڈاکٹر محمود صاحب غریب افتتاحیہ اجلاس میں شریک تھے مجلس مضامین میں نہ وہ موجود تھے نہ یہ مسئلہ یہاں آیا تھا۔ اردو ترکی لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ (ادارہ)

انیس انور

مکتوب لندن

ہفت روزہ ایشیا کی کتابت اور طباعت کے معیار میں اضافہ

جنوری کے ہفت روزہ ایشیا کے معیار کتابت اور طباعت میں نمایاں ترقی ہو گئی تھی امید ہے یہ جریدہ اپنے معیار کو قائم رکھتے ہوئے اسے اور دلچسپ بنانے کی کوشش جاری رکھے گا۔ اس ہفتہ جو نیا انعامی مضامین کے سلسلے کا عنوان ہے "آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے" اس پر پہلا انعام ہو گیا اور ایک سال کے لیے "ایشیا" کا اجرا ہوگا چونکہ یہ مقابلہ برطانیہ میں مقیم اہل قلم حضرات کے لیے مخصوص ہے اس لیے بیرون ممالک کے اصحاب اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد کا عنوان ہے "برطانیہ کے مالی بحران میں ہمارے فرائض کیا ہیں"؛

اردو میں قلمی دوستی

ہفت روزہ مشرق میں شائع شدہ ایک خط کا اقتباس:-

"میرا نام صلاح الدین اور لقب حسین ایوبی ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر برطانیہ کے مختلف اسکولوں میں پڑھنے والے طالب علم مجھے اردو میں خط لکھا کریں۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ اس کی اردو میں مشق جاری رہے تاکہ اس پردیس میں آنے کے بعد وہ اسے بھول نہ جائے لیکن اس کے باوجود یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمیں اردو میں لکھنے پڑھنے کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں اردو زبان سے محبت ہونے کے باوجود ہم آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں؛

مجھے یقین ہے کہ برطانیہ کے علاوہ ہندو پاکستان کے طلبہ بھی صلاح الدین ایوبی سے سلسلۂ مراسلت شروع کریں گے پتہ یہ ہے۔

SALAHUDDIN AYYUBI
64, COLNE ROAD, BRIERFIELD,
NELSON, (LANCS), U.K

برطانیہ میں ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ

اپنے تازہ اداریہ کے ذریعہ مشرق نے برطانوی حکومت سے احتجاج کیا ہے کہ اس ملک میں ہندو پاکستان سے وارد ہو کر آنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو ان کی تعلیمی قابلیت اور پیشہ ورانہ تجربہ کے مطابق کام مہیا نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی انگریزی زبان کی قابلیت کو مشکوک قرار دے کر ان سے نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ دو سو سال تک ہندوستانیوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دینے کے باوجود یہاں کے متعصب انگریز ان کی انگریزی زبان کے معیار کو مشکوک قرار دیتے ہیں حالانکہ اس زبان کو وہ پچھلی تین یا چار پشتوں سے پڑھتے آئے ہیں۔ انگریز بڑے بلا کے HYPOCRITES واقع ہوئے ہیں اس لیے اس غیر ضروری بہانہ سازی کا بھرم یہاں اس وقت کھلتا ہے جب زندگی کے ہر شعبہ میں یہ انگریز انگریزی سے قطعاً نابلد ہندوستانیوں کی انگریزی خوب سمجھ لیتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی انگریزی کے معیار کی تعریف کرنا بھی نہیں بھولتے۔ لیکن نسلی امتیاز برتتے ہوئے ملازمت نہ دینے کا بہانہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ تمہاری انگریزی معیاری نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جس معیار کی انگریزی یہاں انگریزوں سے سننے میں آتی ہے اس پر جانے کسی کا جی ماتم کرنے کو کیوں نہ چاہے۔

مشرق نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ہجرت کرنے والوں کے معیار کا اندازہ برطانوی حکام اگر ہندو پاکستان میں ہی لگا لیں تو بہتر ہے اور یہ کہ واوچر صرف انہی لوگوں کو دیا جائے جنہیں موزوں کام مل سکتا ہے ورنہ یہاں مزدوروں کی آبادی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔

انجمن ترقی اردو جودھپور کی مجلس عاملہ کا انتخاب

جودھپور بتاریخ ۲۸ رجنوری بروز اتوار شام کو چار بجے حویلی خانجی واقع محلہ ببہ میں زیر صدارت جناب ہیتو دان صاحب اُجّول انجمن ترقی اردو، جودھپور کا عام جلسہ منعقد ہوا جس میں حسب ذیل کاروائی عمل میں آئی۔

(۱) جنرل سکریٹری جناب وحید اللہ خاں صاحب نے سال گزشتہ ۱۹۶۷ء کے اجلاس کی میٹنگ کی روئداد پڑھ کر سنائی جس کی تصدیق باتفاق رائے کی گئی۔

(۲) جنرل سکریٹری نے ۱۹۶۷ء کا حساب آمد و خرچ پیش کیا جو باتفاق رائے منظور کیا گیا۔

(۳) باتفاق رائے یہ طے پایا کہ حسب دفعہ ۲ ر (ب) انجمن کی شاخوں کے قواعد کے مطابق انجمن ہذا کی شاخ ضلعی شاخ شمار کی جائے۔

(۴) باتفاق رائے یہ طے پایا کہ حسب ذیل حضرات نے بڑی کاوش سے ممبر سازی کی ہے لہٰذا ان کا انجمن ہذا کی جانب سے شکریہ ادا کیا گیا اور آئندہ کے لیے انجمن کو امید ہے کہ یہ صاحب اپنے تعاون سے نوازتے رہیں گے۔

(۱) جناب ظہور احمد صاحب (۲) توقیم الظفر صاحب وقار رحمانی کوٹوی (۳) جناب محمد انعام صاحب (۴) جناب شیخ عبد الستار صاحب (۵) جناب محمد عثمان صاحب عثمان جودھپوری (۶) جناب غیور احمد صاحب ایڈوکیٹ۔

(۵) جنرل سکریٹری نے ظاہر کیا کہ سال گذشتہ ۱۹۶۷ء میں تین سو دس ممبر ہوئے اور ان سے مبلغ ایک سو چون روپیہ اور پچیس پیسے فیس ممبری کے وصول ہوئے لہٰذا باتفاق رائے یہ طے پایا کہ زیر دفعہ ، (سات) انجمن کی شاخوں کے قواعد آمدنی کا دسواں حصہ یعنی مبلغ سولہ روپے ریاستی شاخ کو ادا کر دیا جائے۔

(۶) جنرل سکریٹری نے کل راجستھان اردو سمپوزیم منعقدہ نومبر ۱۹۶۴ء کی روئداد کا حساب آمد و خرچ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۷ء تک کا پیش کیا۔

(۷) باتفاق رائے یہ طے پایا کہ ممبران انجمن ترقی اردو جودھپور سے زیر دفعہ ۶ ر (ج) انجمن کی شاخوں کے قواعد کی سالانہ فیس صرف چار آنہ لی جائے۔

(۸) انجمن ترقی اردو، جودھپور کی منتظمہ کمیٹی کے عہدیداران و اراکین کی سالانہ فیس ایک روپیہ لی جائے جس کو باتفاق رائے طے کر لیا گیا۔

(۹) باتفاق رائے یہ طے کیا کہ جو نمائندگان انجمن ہذا کے ریاستی شاخ کے لیے منتخب کئے جائیں ان کو زیر دفعہ ۹ انجمن کی شاخوں کے قواعد تین روپے سالانہ جمع کرنا ہوگا۔

(۱۰) باتفاق رائے جناب وحید اللہ خاں صاحب کو اور جناب شیام لال جی صاحب شرما کو ریاستی شاخ کی منتظمہ کمیٹی کے لیے حسب دفعہ ۹ انجمن کی شاخوں کے قواعد کے مطابق منتخب کیا گیا۔

(۱۱) باتفاق رائے یہ طے پایا کہ جامعہ اردو علی گڑھ سنٹر جودھپور کو بطور امداد مبلغ ایک سو پچاس روپیہ ادا کیا جائے۔

(۱۲) جامعہ اردو، علی گڑھ سنٹر جودھپور سے سال گزشتہ میں جن طلبہ و طالبات نے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ان کو اسناد صاحب صدر جناب ہیتو دان صاحب اُجّول نے اپنے دست مبارک سے پیش کیں اور صاحب صدر و تمام اراکین نے اظہار مسرت و اطمینان کیا اور الحاج مولیٰنا مولوی مفتی اشفاق حسین صاحب نعیمی و دیگر اراکین مرکز کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی کاوش سے مرکز میں طلبہ و طالبات کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے اور ان کی تعلیم کا بھی مکمل انتظام ہے۔

(۱۳) باتفاق رائے حسب ذیل حضرات پر مشتمل سال رواں کے لیے منتظمہ کمیٹی کا انتخاب ہوا۔

(۱) جناب ہیتو دان صاحب اُجّول سابق کمشنر و چیرمین راجستھان بورڈ آف ریونیو (صدر)

(۲) جناب الحاج قاضی عبد الجلیل صاحب سابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (نائب صدر)

(۳) جناب شیام لال جی صاحب شرما سابق سب ڈویژنل آفیسر (نائب صدر)

(۴) جناب وحید اللہ خاں صاحب وحید جودھپوری سابق ڈائرکٹر آف ٹرانسپورٹ راجستھان (جنرل سکریٹری)

(۵) جناب ماسٹر عبد القیوم صاحب اختر جودھپوری (جوائنٹ سکریٹری)

(۶) جناب توقیم الظفر صاحب وقار رحمانی کوٹوی ادیب کامل (اسسٹنٹ سکریٹری)

ممبران:۔

جناب پروفیسر پرکاش نرائن صاحب نرمی واستو ڈپٹی رجسٹرار جودھپور یونیورسٹی۔ پروفیسر محمد ہاشم صاحب ترشی ہسٹری ڈپارٹمنٹ جودھپور یونیورسٹی۔ جناب لال جسونت نارائن صاحب ایم۔ اے (اردو) سابق جج راجستھان جناب سوہن جوہن سن سکریٹری ریلوے انسٹی ٹیوٹ جودھپور۔

جناب جگت نارائن صاحب ماتھر
جناب دین دیال صاحب شرما سابق ڈویژنل کمرشیل آفیسر ناردرن ریلوے جودھپور
جناب سنتوش سنگھ جی صاحب کچھاوا سابق ایم۔ایل۔اے
جناب خان مرزا صاحب جاگیردار محمد ابراہیم صاحب الحاج امداد علی صاحب، الحاج محمد حاجی صاحب ٹھیکیدار جناب محمد عادل عثمان صاحب عثمان جودھپوری۔ جناب محمد حسین صاحب مبشر جودھپوری۔ الحاج بابو رحمت اللہ صاحب۔ جناب ایس۔ ایم۔ یوسف حسین صاحب۔ جناب شیخ عبد الستار صاحب۔ جناب ڈاکٹر کشن سنگھ جی صاحب دیوڑا سابق میڈیکل آفیسر جودھپور۔

انجمن ترقی اردو شاخ پیلی بھیت کی مجلس عاملہ کا انتخاب

پیلی بھیت ۔۔۔ سال میں انجمن ترقی اردو پیلی بھیت کی مجلس عاملہ کی ایک میٹنگ بصدارت جناب عبد الحفیظ نعیمی صاحب وکیل صدر انجمن بر مکان صدر موصوف منعقد ہوئی جس میں باتفاق رائے مندرجہ ذیل صاحبان آئندہ تین سال کے لیے انجمن کے عہدے داران منتخب ہوئے۔

۱۔ جناب عبد الحفیظ نعیمی صاحب وکیل ۔ صدر (۲) جناب سید عبد الجلیل حسنی صاحب پرنسپل ۔ نائب صدر (۳) جناب حاجی محمد ظہیر صاحب ۔ نائب صدر (۴) جناب محمد بدر الحسن قادری صاحب ۔ جنرل سکریٹری (۵) جناب مرتضیٰ علی قادری صاحب ۔ جوائنٹ سکریٹری (۶) جناب محمد عمر صاحب نہالی ۔ سکریٹری نشر و اشاعت (۷) جناب امان اللہ خاں صاحب وکیل خازن۔

اس کے علاوہ ۱۵ ممبران مجلس عاملہ کے لیے منتخب ہوئے۔

(محمد بدر الحسن صاحب قادری۔ جنرل سکریٹری)

جشن غالب کے موقع پر انجمن ترقی اردو گوالیار کا پروگرام

گوالیار۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۶۸ء کے تاریخی دن اور مبارک موقع پر عظیم شاعر اور نثار مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء میں منانے کے سلسلے میں، ساہتیہ سدن، گوالیار میں شب کے سات بجے شہر کے معزز علم دوست حضرات، فن کار، ادیب، مصور اور محقق حضرات کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں "غالب صد سالہ برسی انتظامیہ کمیٹی" کی تشکیل ہوئی۔

میٹنگ میں یہ طے پایا کہ کمیٹی ایسے گوناگوں پروگرام مرتب کرے جو مرزا غالب کی حیات کے سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالیں نیز میٹنگ میں متعدد تجاویز غالب کی یادگار منانے کے لیے پاس کی گئیں۔ دیگر تجاویز کے علاوہ کمیٹی غالب کے بارے میں دستورِ اساسی کی ۱۶ زبانوں میں ایک کتاب شائع کرے گی جس میں غالب پر ببلیوگرافی (BIBLIOGRAPHY) بھی شامل ہے۔ غالب کے متعلق شہر کے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے تحریری، تقریری، مصوری اور موسیقی کے مقابلے بھی کرائے جائیں گے۔ جناب کاشی ناتھ گپتا نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ جناب اسلام الدین اس کمیٹی کے کنوینر مقرر ہوئے انتظامیہ کمیٹی کے ۲۲ ممبران چنے گئے۔

(اسلام الدین کنوینر غالب صد سالہ انتظامیہ کمیٹی جے اندر گنج گوالیار آندھرا پردیش)

انجمن ترقی اردو گورکھپور کی جانب سے جشن غالب منانے کا فیصلہ

گورکھپور، ۱۸ر فروری کو دفتر "اشتراک" میں سہ پہر تین بجے انجمن ترقی اردو شاخ گورکھپور کی ایک میٹنگ ہوئی جس کی صدارت عالی جناب برج موہن سہائے ملن جی صدر انجمن ترقی اردو گورکھپور نے کی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، بدیع الزماں اعظمی، ایم کوٹھیاوی راہی، اشفاق احمد اعظمی، عبد الحنان ظاہری، جوہر وارثی، پیام گورکھپوری، طالب نعمانی، پروفیسر اعجاز احمد اور دیگر ممبران انجمن کی متفقہ رائے پر طے پایا کہ گورکھپور میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے اعلیٰ پیمانہ پر جشن غالب منایا جائے۔ اس سلسلہ میں گورکھپور کی ہندی اردو کی ادبی انجمنوں اور اہم ادبی اداروں کے عہدہ داروں کو بھی مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک استقبالیہ کمیٹی بھی بنائی گئی۔ (سکریٹری انجمن ترقی اردو گورکھپور)

انجمن ترقی اردو ودیشہ میں شعری نشست

بھوپال، انجمن ترقی اردو ودیشہ نے جنگ آزادی کے مجاہد شاعر فضل حق سرور مرحوم کا دن منایا۔ انجمن کے صوبائی دفتر میں یہاں جو اطلاع موصول ہوئی ہے اس کے مطابق اس جلسہ کی صدارت علامہ محوی صدیقی نے کی۔

اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں علامہ محوی صدیقی، مولانا صدر الدین صدر، چودھری وارث علی عاشق علی، محمد اسمٰعیل ناشاد، گوہر جلالی، منیر محوی، سردار مہندر سنگھ آثر، منظور کوثر، عزیز، نثار، ریاض، رشید، مشتاق، اختر فاروق علی صاحبان نے اپنا کلام سنایا۔

(حسنات صدیقی آنریری سکریٹری مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو)

صفحہ ۲ سے آگے

سے نہ دیکھتا ہو۔ دوسرے الفاظ میں ابلاغ کا عمل ایک دو طرفہ عمل ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ریڈیو کے ٹرانسمیٹر (TRANS MITTER) اس کی میڈیم اور اس سیٹ ریسیور کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ٹرانسمیٹر کتنا ہی زوردار ہو، اگر ریسیور اس موج کو نہیں پا سکتا تو اسے کچھ حاصل نہ ہوگا اور اگر میڈیم میں خامی ہوگی تو بھی ریسیور کچھ نہ کر سکے گا۔ آج ابلاغ کے سلسلے میں جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں وہ نئے نہیں ہیں۔ ہر دور میں انفرادیت رکھنے والے شعرا کی بات سمجھنے والے کم ہوتے ہیں، مانوس سانچوں کے عادی اور دیکھے بھالے حسن کے خوگر زیادہ۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ شاعری صرف جذباتی اظہار نہیں، علامتی اظہار بھی ہے۔ ہر فرد اور ہر دور کے مخصوص علامات ہوتے ہیں۔ یہ علامات کبھی کبھار ماضی قریب کے بجائے ماضی بعید کے سرمائے سے یعنی بھولی بسری روایت سے لیے جاتے ہیں یا دیو مالا سے یا جدید دور کے علوم سے۔ عام پڑھنے والا ان سے آشنا ہونے کی زحمت نہیں کرتا اور شاعری اور ادب کو بھی چاشنی، چٹخارے، منفتے، نجات، تفریح، کچھ محرومیوں کی تلافی، کچھ نظریات کی علمبرداری کے معیار سے پرکھتا ہے۔ غالب کی مثال سے یہ واضح ہو جائے گا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو عام طور پر زمانے کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور زمانے کی آنکھ اس وقت کھلتی ہے جب شاعر کی آنکھیں بند ہو چکی ہوتی ہیں۔ جو لوگ کلاسیکل موسیقی یا بھارت ناٹیم رقص سے واقف نہیں انھیں یہ موسیقی ایک شور اور یہ رقص بلا وجہ اعضا کا توڑنا مروڑنا معلوم ہوگا۔ اسی طرح جو لوگ شاعری کے معنی مقررہ بحروں میں قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں وہ آزاد نظم یا شعر منثور کی شعریت اور شاعری میں لفظ کے تخلیقی استعمال کو کیسے پا سکیں گے۔ چونکہ اب تک ہماری شاعری پبلک وژن زیادہ رہی ہے ذاتی، انفرادی، پرائیویٹ وژن کم، اس لیے آج کی شاعری سے جو پرائیویٹ وژن رکھتی ہے، لوگ ابھی مانوس نہیں ہوئے ہیں۔ پبلک وژن کے لیے نثر زیادہ موزوں ہے۔ ہم ابھی تک اس میں کچھ مانوس شاعرانہ ادائیں ڈھونڈتے ہیں، نثر کے اپنے حسن کو نہیں پہچان پاتے۔ غرض جیسے جیسے ادب کا اپنا رول، اس کا اپنا منصب، اس کی اپنی اہمیت واضح ہوتی جائے گی، ادبی اظہار کے ابلاغ بننے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ اس لیے آج کے تجربات کو ہمدردی سے دیکھنا چاہیے بشرطیکہ یہ تجربے محض نقالی نہ ہوں، انفرادیت رکھتے ہوں۔ تجربے کے سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہر تجربہ کسی نہ کسی بھولی ہوئی روایت کی توسیع یا بازیافت ہوتا ہے۔ جمیل مظہری نے اس جلسے کی بھی صدارت کی آخر میں حاضرین کے اصرار پر انھوں نے اور میں نے کچھ شعر بھی سنائے۔ جمیل مظہری خاصے جذباتی آدمی ہیں۔ کہنے لگے کہ سرور صاحب کے خیالات سے مجھے پچھتر فی صدی اتفاق ہے، پچیس فی صدی اختلاف ہے جس کے اظہار کا یہ موقع نہیں۔ مگر حاضرین کو یہ جتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ خیالات ایک ایسے ادیب کے ہیں جس نے برسوں ان مسائل پر غور کیا ہے اور اس لیے آج کا اجتماع ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

میرا بھتیجا اقبال جو رانچی میں انجینئر ہے مصر تھا کہ میں دو ایک دن رانچی میں قیام کروں، مگر جمیل مظہری جلسے کے بعد کار سے گیا جانے والے تھے انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ ساتھ چلو اور ان کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنے کے خیال سے میں پانچ بجے مہمان خانہ سے سامان لے کر ان کے دوست انور حسین کے مکان پر پہنچا جو رانچی کے چوٹی کے وکیلوں میں ہیں اور جنھوں نے فسادات میں مظلوموں کی بڑی مدد کی اور بڑی ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا۔ ہم لوگ چھ بجے شام کو روانہ ہوئے۔ خیال تھا کہ چار ساڑھے چار گھنٹے میں گیا پہنچ جائیں گے اور میں وہاں سے کالکا میل پکڑ سکوں گا۔ مگر کار کی روشنی کم تھی۔ راستے میں ٹریفک بہت تھا اور انور صاحب بھی محتاط آدمی ہیں۔ غرض ہزاری باغ پہنچتے پہنچتے نو بج گئے۔ وہاں سرراہ ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ یہاں قیمہ بڑے مزے کا تھا۔ دس بجے کے قریب یہاں سے روانہ ہوئے۔ جمیل مظہری نے فرمائش کی کہ ادھر دو تین سال میں جو کچھ کہا ہے سب سنا دو۔ غرض ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑا۔ جمیل مظہری کو شعر سنانے میں لطف آتا ہے وہ اچھا شعر سنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بجلی کا تار انھیں چھو گیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو یہاں لکھ دینا ضروری ہے۔ فرمانے لگے کہ سرور صاحب آپ کی تنقید کی وجہ سے آپ کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ خدا جانے وہ صحیح کہتے ہیں یا دوسرے لوگ جو محض تنقید کے قائل ہیں۔ ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں غلط کہتے ہوں۔ جمیل مظہری نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ شاعرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔ ایک احساس، ہیجان، ایک ہیجانی کیفیت ہمیشہ ان پر طاری رہتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ انھوں نے جلتے ہوئے سگرٹ سے اپنا دامن یا پاس بیٹھے ہوئے شخص کا ہاتھ جلا دیا۔ میرے اصرار پر انھوں نے اپنے شعر بھی سنائے۔ ایک مطلع ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے

ہم پھول دشت میں نہ کھیتوں پہ گھٹا ہیں
جلتے ہوئے تپتے ہوئے صحرا کی دعا ہیں

جب اشعار کا اسٹاک ختم ہو گیا تو میر، غالب، انیس، اقبال، حسرت، فانی، جگر، شاد کے اشعار اور ان کی خصوصیات پر باتیں ہونے لگیں۔ رات کا سناٹا، کچھ دھندلی اور لطیف چاندنی۔ کار جنگلوں اور میدانوں میں سے گزر رہی تھی۔ درختوں کے سائے بھوتوں کی طرح ابھرتے تھے اور روشنی میں تحلیل ہو جاتے تھے۔ ہم دونوں زندگی کے مسائل اور مصائب سے بے نیاز، شاعری اور شاعروں کی دنیا میں تھے۔

غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی سے خواب بیٹھے تھے
یہ رات اور یہ سفر یاد رہے گا۔

ایک بجے کے قریب پہنچے۔ جمیل مظہری کے اصرار پر رات انور صاحب کے داماد علی امام کے یہاں گزاری۔ صبح سات بجے مظہری اور انور تو پٹنہ کے لیے روانہ ہوئے اور میں علی گڑھ کے لیے مغل سرائے سے دہلی یا دون ایکسپریس پکڑی اور ۱۹ فروری کو ساڑھے تین بجے صبح علی گڑھ آ گیا۔ اور اب

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پروفیسر آلِ احمد سرور

میرا صفحہ

مجھے سفر میں بہت لطف آتا تھا۔ اب سفر کی زحمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ وہ مزا نہیں رہا۔ پہلے سے جگہ محفوظ کرانے کے باوجود بعض اوقات نہیں ملتی۔ گاڑیوں کے وقت کا کچھ ٹھیک نہیں۔ چوری کا خطرہ بڑھ گیا ہے اور اب تو ریل میں قتل بھی ہونے لگے ہیں۔ اس لیے جب بالکل مجبور ہو جاتا ہوں تبھی لمبا سفر کرتا ہوں۔

رانچی یونی ورسٹی کے پی ایچ ڈی کے زبانی امتحان کے سلسلے میں رانچی جانا تھا۔ کالکا میل سے جگہ پہلے سے محفوظ کرا لی تھی مگر گاڑی آئی تو معلوم ہوا میرا نام ہی نہیں۔ خیر ایک برتھ مل گئی۔ تیز رفتار گاڑی، موسم معتدل اور خوشگوار، ریل کی پٹری کے دونوں طرف گیہوں کے سبز کھیتوں میں سرسوں کے پیلے پھول حدِ نظر تک پھیلے ہوئے، آنکھوں کی طراوت اور روح کی بالیدگی کا باعث۔ میں نے کوئسلر کی نئی کتاب مشین میں بھوت (THE GHOST IN THE MACHINE) پڑھنی شروع کی۔ خاصی عالمانہ کتاب ہے اور جدید نفسیات، حیاتیات اور سماجیات کا نچوڑ۔ کوئسلر کہتا ہے کہ انسان کے دماغ نے بڑی ترقی کی ہے مگر کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے اس میں تعمیری صلاحیت کے ساتھ ایک تخریبی میلان بھی ہے۔ کوئسلر BEHAVIORIST کے خلاف ہے اور GESTALT والوں سے متاثر ہوتے ہوئے ان سے الگ راہ نکالتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی دماغ کے تخریبی میلان کو کیمیاوی اجزا کے ذریعہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔ صبح تین بجے گومو پر مجھے گاڑی بدلنی تھی۔ وہاں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرا نام رانچی ایکسپریس میں انتظار کرنے والوں کی فہرست میں ہے۔ گاڑی آنے پر ایک خالی کوپے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ دو میاں بیوی آ گئے جن کے نام یہ برتھ تھا۔ میں نے جب ساری گاڑی میں کہیں جگہ نہ پائی تو اس جوڑے سے درخواست کی کہ مجھے کوپے کے فرش پر سونے کی اجازت دے دیں۔ وہ بڑے شریف آدمی تھے۔ انھوں نے اوپر کی برتھ مجھے دے دی اور خود بیوی بچوں کو لیے نیچے کی برتھ پر بیٹھے رہے۔ مجھے خیال آیا کہ بھل منساہت، شرافت اور انسانیت کا ہمارے ملک میں کال نہیں ہوا۔ جب ذرا حالات کی وجہ سے کچھ عقیدہ ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے تو کچھ اچھے آدمی مل ہی جاتے ہیں۔

آٹھ بجے کے بعد سو کر اٹھا تو رانچی کے قریب جھارکھنڈ کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ علاقہ زیادہ بلندی پر نہیں ہے۔ غالباً دو ہزار فٹ ہوگا۔ پہاڑیاں گھنے چھوٹے چھوٹے پیڑوں سے لدی ہوئی ہیں۔ آدی واسیوں کی عورتوں کے غول کے غول ریل میں سے نظر پڑے۔ سیاہ فام۔ جوش کی کوہستان دکن کی عورتوں پر نظم یاد آ گئی۔ رانچی میں اگست میں خاصا بڑا فساد ہوا۔ اردو کا حق مانگنے والوں کو تنگ نظر اور متعصب عناصر نے اس کی سزا دینی چاہی۔ بڑی تعداد میں جانیں ضائع ہوئیں، مالی نقصان علیحدہ۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ اپنی زبان کا حق مانگو تو کچھ لوگ جان و مال کے درپے ہو جاتے ہیں۔ گو حالات اب نارمل ہو گئے ہیں، مگر کون جانے کس وقت پھر کوئی دورِ فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔

ساڑھے نو بجے رانچی پہنچا۔ اسٹیشن پر شمس مظفرپوری، علی سجاد اور کچھ اور لوگ موجود تھے۔ یونی ورسٹی کے مہمان خانے گیا۔ وہاں منھ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور پھر جمیل مظہری کو ان کی قیام گاہ سے لیتا ہوا یونی ورسٹی کے دفتر پہنچا۔ جمیل مظہری اس دور کے چوٹی کے شعرا میں ہیں اور جوش اور فراق کے ساتھ ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ صرف بڑے اچھے شاعر ہیں بلکہ بڑے اچھے دوست اور بڑے مخلص انسان ہیں۔ مجھ سے آزردہ تھے۔ میرا قصور یہ تھا کہ ان کے کئی خطوں کا جواب نہ دے سکا تھا۔ ملے تو کہنے لگے آپ سے بڑی شکایت ہے۔ میں نے کہا کہ شکایت ہے تو غنیمت ہے۔ میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ ابھی محبت باقی ہے ورنہ شکایت بھی نہ ہوتی۔ ہنسے اور اس گرمجوشی سے لپٹ گئے گویا خفا ہی نہ تھے۔

زبانی امتحان ختم کرنے کے بعد انجمن ترقی اردو رانچی کے کارکنوں کے اصرار پر ان کے ایک جلسے کو خطاب کیا۔ یہ جلسہ مولانا آزاد اسکول میں کیا گیا تھا۔ اسکول اس جگہ قائم کیا گیا ہے جہاں مولانا آزاد پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں نظر بند ہوئے تھے۔ حالیہ فسادات میں اسکول پر حملہ ہوا اور اس کی عمارت کو نقصان پہنچا مگر رانچی کے اردو دوستوں نے بڑے استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ اسکول کی نئی عمارت تیار ہو چکی ہے۔ انجمن کے کارکن بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ ان میں ہمت بھی ہے اور سوجھ بوجھ بھی۔ میں نے احتجاجی کارروائیوں کے بجائے تعمیری کاموں پر زور دیا تاکہ اردو دوستوں کی طاقت بڑھے اور ہمارے مطالبات کے تسلیم کیے جانے کے لیے فضا سازگار ہو۔ کچھ سوالات بھی کیے گئے جن کا میں نے جواب دیا۔ رسم خط کے متعلق ایک سوال سے اندازہ ہوا کہ رسم خط کی تبدیلی کی تحریک کا وہاں بھی اثر ہوا ہے۔ میں نے صاف کہا کہ اردو رسم خط کو چھوڑنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ہاں جدید تعلیمی اور طباعتی ضروریات کے لیے اس کی اصلاح پر ضرور غور ہو سکتا ہے۔ مگر اردو کی کچھ کتابیں دیوناگری یا رومن رسم خط میں بھی چھپیں تو اچھا ہی ہے کیونکہ اس طرح اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ جمیل مظہری نے جلسے کی صدارت کی۔ دو بجے شمس مظفرپوری کے یہاں لنچ تھا اور تین بجے رانچی سائنس کالج میں ادب میں ابلاغ کے مسئلے پر میری تقریر رکھی گئی تھی۔ وائس چانسلر ماریکم جو غالباً ایک پادری ہیں، پرنسپل بوس اور دوسرے اساتذہ بھی موجود تھے۔ وائس چانسلر نے جلسے کا افتتاح کیا۔ طلبہ خاصی تعداد میں جمع تھے۔ عثمانی نے میرا تعارف جس طرح کیا اس سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے میری تحریروں کا حرف حرف پڑھا ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ادب بنیادی طور پر جمالیاتی اظہار ہے گو اس میں سماجی اور اخلاقی پہلو بھی موجود رہتے ہیں۔ ہر اظہار ایک حد تک ابلاغ ہوتا ہے کیونکہ مکمل ابلاغ کے لیے ذہنوں کی ہم آہنگی ضروری ہے۔ فنکار زیادہ مرتب ذہن رکھتا ہے، عام پڑھنے والے اتنا مرتب ذہن نہیں رکھتے۔ ان کے احساسات بھی محدود ہوتے ہیں اور وہ رسمی ردعمل زیادہ رکھتے ہیں۔ فن کار اپنے مخصوص شعور اور بصیرت کو اسی وقت عام کر سکتا ہے جب پڑھنے والا اس کے ساتھ ذہنی سفر کے لیے آمادہ ہو اور ادب کو کسی نشے یا فرار ہونے کی عینک

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر منیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا